بحث ونظر

اسلامی معاشیات
ایک تعارف

جناب اوصاف احمد

اسلامی معاشیات، علم معاشیات کی ایک واضح، متبادل اور ممتاز شاخ کے طور پر تیزی سے درجۂ استناد حاصل کرتی جارہی ہے۔ حالیہ برسوں میں، اور بالخصوص گذشتہ دس برسوں میں بعض مسلم ممالک نے اپنے ملکوں میں اسلامی معاشی نظام کے قیام کو اپنی ریاستی پالیسی کا مقصد قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے متعلقہ میدانوں میں بھی اہم وقوع ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ مختلف مسلم اور غیر مسلم ممالک میں متعدد اسلامی مالیاتی اداروں کا قیام عمل میں آیا ہے۔ مغربی ایشیا میں واقع کئی مسلم ممالک کی یونیورسٹیوں نے اسلامی معاشیات کی باقاعدہ تدریس کا اہتمام کیا ہے بعض برطانوی اور امریکی یونیورسٹیوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے لکھے جانے والے مقالات کے لیے اسلامی معاشیات سے متعلق موضوعات قبول کیے ہیں اور ان مقالات پر ڈگریاں عطا کی ہیں۔ دنیا کے مختلف حصّوں میں، اسلامی معاشیات پر اعلیٰ درجہ کی تحقیقات کرنے کی غرض سے قومی اور بین الاقوامی تحقیقاتی اداروں کا قیام بھی عمل میں آیا ہے۔

اس ساری سرگرمی اور ہماہمی کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی معاشیات میں لوگوں کی دلچسپی اور تجسّس میں اضافہ ہوا ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو اسلام، اس کے طرزِ زندگی اور اسلامی تعلیمات سے ناواقف ہیں لیکن معاشیات سے علمی دلچسپی رکھتے ہیں اس قسم کے سوالات اُٹھانے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ کیا واقعی اسلام ایک متبادل سماجی و معاشی نظام پیش کرتا ہے جو سرمایہ داری، اور سوشلزم سے مختلف ہے؛ کیا یہ موجودہ صنعتی تہذیب کی پیچیدگیوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔ کیا یہ ان سنگین مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے جن کے سامنے کئی ہم عصر سماجی فلسفے اپنے آپ

کو مجبور محض پاتے ہیں؛ کیا اسلامی معاشیات جیسے کسی علم کا واقعی وجود ہے یا ہو سکتا ہے؛ یا اس کی ضرورت ہے؛ وغیرہ۔

اس مقالہ کا مقصد اردو داں طبقہ کے سامنے اسلامی معاشیات اور اس کے موضوعات کا ایک تعارف پیش کرنا ہے کیونکہ اسلامی معاشیات پر جو تحقیقی اور فنی کام ہوا ہے وہ بیشتر انگریزی، اور عربی، اور کسی حد تک ترکی زبانوں میں ہے جن تک اردو داں طبقہ کی رسائی محدود ہے۔

اسلامی معاشیات کا ظہور

نہ صرف اسلامی معاشیات بلکہ علم معاشیات کو بھی نسبتاً ایک جدید علم متصور کیا جاتا ہے۔ اگر ایڈم اسمتھ کی کتاب "دولت اقوام کے اسباب وعلل کی جستجو (An enquiry into nature and causes of wealth of nations) کی اشاعت کو نقطۂ آغاز مان لیا جائے (جیسا کہ تاریخ معاشیات کی بیشتر درسی کتابوں میں کیا جاتا ہے) تو معاشیات کی تاریخ دو سو سال سے ہی زیادہ بنتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ریاضیات، طب، طبیعات، کیمیا، فلکیات، فلسفہ اور تاریخ جیسے علوم کی تاریخ کئی ہزار سال پر محیط ہے۔ اس لیے معاشیات کو ان علوم کی بہ نسبت ایک جدید علم قرار دیا جاتا ہے۔ مزید براں معاشیات کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ایک اینگلو سیکسن علم ہے کیونکہ معاشیات کے بیشتر اصول وقوانین اینگلو سیکسن اقوام کے افراد کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ بہ حیثیت علم کے، معاشیات کی تدوین جس زمانہ میں ہوئی وہ اینگلو سیکسن تہذیب کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر معاشیات کے علمی کارناموں میں ان کا حصّہ دوسری تہذیبوں کے مقابلہ میں قدرے زیادہ ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسری عالمی تہذیبوں اور دوسرے زمانوں میں معاشی مسئلوں کے بارے میں سرے سے کوئی غور وفکر ہی نہیں کیا گیا اور ان کا دامن ان کارناموں سے خالی ہے۔ لیکن معاشی افکار کی تاریخ اس طرح مرتب کی جاتی رہی ہے کہ اس کو خالص اینگلو سیکسن اقوام کا کارنامہ قرار دیا جا سکے۔

اس کلیہ سے اگر کوئی استثناء ہے تو وہ ابن خلدون (۷۳۲-۸۰۸ھ مطابق

۱۳۳۲-۱۴۰۶ء) ہے جن کے خیالات کو معاشی افکار کی تاریخ میں جگہ دی گئی ہے مشہور جرمن ماہر معاشیات جوزف شوم پیٹر (Joseph Schumpeter) نے اپنی کتاب "معاشی تجزیہ کی تاریخ (History of Economic Analysis)" میں ابن خلدون کے کارناموں کا خصوصی تذکرہ کیا ہے۔ اس ایک استثناء کے ساتھ غالباً یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ عام طور پر معاشی مورخین اور ماہرین معاشیات نے معاشیات کی اسلامی روایت اور مسلم مفکرین کے معاشی کارناموں کو نظر انداز کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ (۱۵۰ھ مطابق ۷۶۷ء) امام مالک (۱۷۹ھ مطابق ۷۹۵ء) امام ابو یوسف (۱۸۲ھ مطابق ۸۰۱ء) شیبانی (۱۸۹ھ مطابق ۸۰۴ء) امام ابو عبید (۲۲۴ھ مطابق ۸۳۸ء) ماوردی (۴۵۰ھ مطابق ۱۰۵۸ء)، ابن حزم (۴۵۶ھ مطابق ۱۰۶۴ء) غزالی (۵۰۵ھ مطابق ۱۱۱۱ء) اور ابن تیمیہ (۷۲۸ھ مطابق ۱۳۲۸ء) کے معاشی افکار کا سنجیدگی سے گہرا مطالعہ نہیں کیا گیا۔ اگر ان، اور دوسرے مسلم مفکرین کے معاشی افکار کا تفصیلی اور عمیق مطالعہ کیا جائے اور معاشی تصورات کے ارتقاء سے ان کا مقابلہ کیا جائے، تو نہ صرف یہ ہوگا کہ ان مفکرین کے بارے میں ہمارے علم میں اضافہ ہوگا بلکہ معاشی تصورات کے ارتقا کی تاریخ میں بھی قابل لحاظ زمانی اضافہ کی امید کی جا سکتی ہے۔

عام طور پر معاشیات کی تاریخ جس طرح بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ معاشی تفکیر کا آغاز ارسطو (۳۸۴-۳۲۲ قبل مسیح) سے ہوا۔ بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں مکالماتی اسکول (Schelastic school) کے علماء نے ارسطو کی فکر کو آگے بڑھایا۔ پھر چودھویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں تجارت پسند (Merchantalist) اور سولہویں وسترہویں صدی عیسوی میں زراعت پسند (Physiocrats) مفکرین نمودار ہوئے۔ اس پورے عہد میں معاشی تفکیر کی صورت حال یہ رہی کہ اہم معاشی مسائل کے بارے میں جہاں تہاں اظہار خیال کیا گیا اور سماجی فلسفہ کے ضمن میں بعض معاشی تصورات کا استعمال کیا گیا۔ پہلی کتاب، جس میں علم معاشیات کو منضبط شکل میں پیش کیا گیا آدم اسمتھ کی "دولت اقوام (Wealth of nations) تھی جو ۱۷۷۶ء میں شائع ہوئی۔ ارسطو سے لے کر مکالماتی اسکول کے علماء کے ظہور کے درمیان ایک بڑا زمانی فاصلہ ہے جس میں کسی طرح کی علمی تحریک نظر نہیں آتی۔ مغربی مورخین اور مفکرین نے یہ کہہ کر اس زمانی خلاء

کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ازمنہ وسطیٰ ایک تاریک عہد تھا جس میں یورپ جہالت اور غفلت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ درست! لیکن کیا اس زمانے میں پوری نسلِ انسانی کا ذہن اتنا بنجر ہو چکا تھا کہ دنیا کے کسی حصہ میں بھی، معاشی موضوعات، پیداوار، تقسیم، تبادلہ، بازار، قیمت اور زر کے بارے میں کوئی سوچ بچار نہیں کیا گیا۔ گمان اغلب یہی ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہونا چاہیے۔ فکرِ انسانی میں تو ایک تسلسل ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جب دنیا کا کوئی حصہ 'تاریک عہد' (Dark ages) میں داخل ہو جاتا ہے تو دانشوری کے مراکز دوسرے حصّوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے منطقی بنیاد پر معاشی افکار کی تاریخ میں بھی تسلسل ہونا چاہیے لیکن جس طرح یہ تاریخ لکھی جاتی رہی ہے اور پڑھائی جاتی رہی ہے اس میں تسلسل کے بجائے ایک بڑا تاریخی خلا پایا جاتا ہے۔

اس حقیقت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو جب یوروپ "تاریک عہد" میں تھا اور اس کی ذہنی قوتیں سوئی پڑی تھیں اس وقت اسلامی دنیا علمی سرگرمیوں کا مرکز تھی اس کی یونیورسٹیاں طلبا، اور اساتذہ سے آباد تھیں۔ اس کے علماء، دانشور، فلسفی، مفکرین اور فقہاء مختلف علوم کی آخری سرحدوں پر علمی تحقیق اور چھان بین میں مصروف تھے۔ انسانی اعمال کا معاشی پہلو بھی ان کی توجہ و تحقیق سے محروم نہیں رہا اور اس میدان میں بھی انھوں نے دوسرے علوم کی طرح اہم اور وقیع کام سرانجام دیا۔ جس وقت یورپ میں معاشی فکر انتشار کا شکار تھی اس وقت اسلامی دنیا میں کتاب الخراج اور کتاب الاموال جیسی کتابیں لکھی جا رہی تھیں۔

مسلم علماء اور مفکرین نے اپنے عہد کے اہم معاشی مسائل پر اسلامی اقدار اور شریعت کے فراہم کردہ بنیادی ڈھانچہ کی روشنی میں غور و خوض کیا۔ اس وقت اسلامی ممالک کی معاشی تنظیم بھی اسلامی اقدار سے ہم آہنگ تھی اس لیے مسلم مفکرین کے افکار و تصوراتِ معیشت کی عملی کارکردگی میں ممد و معاون تھے۔ بدقسمتی سے دو ایسے واقعات نے اس عمل میں رخنہ اندازی کی کہ علمی ترقیوں کا یہ تسلسل نہ صرف یہ کہ برقرار نہ رہ سکا بلکہ زوال پذیر ہو گیا۔ ان میں سے پہلا واقعہ تو سقوط بغداد (۱۲۵۸ء) تھا جس نے علمی ترقیوں کی راہ مسدود کر دی۔ تخلیقی فکر اور اجتہادی تحقیق سے ہٹ کر توجہ صرف علمائے سلف کی تحریروں کی شرح و تعبیر تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اجتہاد کا دروازہ

بند ہوگیا اور تقلید کی راہ کھل گئی۔ "پابستگیٔ رسم و رہِ عام علمی فکر کا معراج قرار پائی۔ طرزِ فکر کے مروجہ سانچوں کے خلاف ہٹ کر کوئی بات کہنا "طعن عام" کا سبب بننے لگا۔ یہ صورتِ حال کئی سو برس تک قائم رہی بلکہ اس کے باقیات اب تک مختلف مسلم ممالک اور معاشروں میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ دوسرا سانحہ، جس کے مضمرات پہلے واقعہ سے کم ضرر رساں اور دور رس نہ تھے، اٹھارویں صدی میں وقوع پذیر ہوا جب بہت سے مسلم ممالک، نوآبادیاتی تسلّط کا شکار ہو گئے۔ سقوط بغداد نے صرف مسلم اقتدار پر ضرب لگائی تھی۔ مغربی ممالک کے نوآبادیاتی تسلّط نے نہ صرف سیاسی اقتدار کو اپنا نشانہ بنایا بلکہ اسلامی اقدار اور اداروں کو بھی تباہی کے دہانے پر پہونچا دیا اور اسلامی معاشروں میں اجنبی اقدار کو رواج دیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد زیادہ تر مسلم ممالک نوآبادیاتی تسلّط سے آزاد ہو گئے لیکن سیاسی آزادی سے قبل ان مسلم ممالک میں اسلامی اقدار کی دریافت نو اور اسلامی تشخص کی بازیافت کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ مختلف مسلم ممالک میں ایسے مفکر اور علماء پیدا ہوئے جنھوں نے اسلامی نظام کے عناصر، اور اُس کی برکتوں پر از سر نو زور دیا اور اسلامی تعلیمات کی تعبیر عصری مسائل کے حوالے سے کی۔ چنانچہ ان علماء کی توجہ موجودہ عہد کے معاشی مسائل کی جانب بھی گئی اور انھوں نے موجودہ صنعتی نظام کے حوالے سے اسلام کی معاشی تعلیمات اجاگر کیں۔ ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ اور اس کے بعد کے برسوں میں، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری، سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، حسن البنا، اور سیّد قطب کے ایسے افکار سامنے آئے جن میں اسلام کے اقتصادی نظام کے نمایاں پہلو اجاگر کیے گئے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں ایک مسلم ماہر معاشیات، ڈاکٹر انور اقبال قریشی کی کتاب "اسلام اور نظریۂ سود" (Islam and theory of Interest) منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں پہلی بار ایک جدید تعلیم یافتہ ماہر معاشیات نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ معاشی نظریات کی قدر و قیمت کا تعین اسلامی اقدار کے تناظر میں کیا جائے۔ ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی کتاب، غیر سودی بنک کاری شائع ہوئی جس میں غالباً پہلی بار تجارتی بنک کاری کو غیر سودی بنیادوں پر قائم کرنے کا تفصیلی خاکہ پیش کیا گیا۔ اس وقت سے آج تک، ان مسلم ماہرین معاشیات کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہو چکا ہے جو معاشی

عمل، اور معاشیات کا مطالعہ اسلامی تناظر میں کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اسلامی معاشیات کے موضوع پر انگریزی اور عربی میں قابل لحاظ علمی سرمایہ اکٹھا ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ اسلامی معاشیات کے نام پر اس وقت جو لٹریچر موجود ہے اس کا انداز مناظرانہ نہیں ہے بلکہ اس کا طریق کار تجزیاتی ہے کیونکہ اس میں معاشی تجزیہ (Economic Analysis) کے متداول اور معروف فنی طریقۂ کار سے کام لیا جاتا ہے۔ اسلامی معاشیات کے اس روز افزوں لٹریچر کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ اسلامی اقدار پر مشتمل اقتصادی نظام کیونکر قائم کیا جا سکتا ہے اور قائم ہونے کے بعد یہ نظام کس طرح کام کرے گا۔

تاریخی اعتبار سے اسلامی اقتصادی نظام کی جانب توجہ غیر سودی نظام بنکاری کے توسط سے مبذول ہوئی۔ موجودہ زمانے کی معیشت میں بنک کاری کی اہمیت سے اور معاشی زندگی کی ترقی میں اس کے رول سے، خاص و عام، سبھی کسی نہ کسی طور پر واقف ہیں۔ یہ حقیقت بھی عام طور پر معروف ہے کہ جدید بنک کاری نظام، ایک متعین شرح سود کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے جبکہ اسلام سود یا ربا کو حرام قرار دیتا ہے۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ اسلامی نظام کے تحت جدید بنک کاری کا نظام کس طرح عمل پذیر ہوگا۔

اس سوال کا جواب دینے کی کوششوں کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ اسلامی بنک کاری کا نظریہ وجود میں آیا بلکہ اس سے متعلقہ دوسرے اہم مسائل کی جانب بھی توجہ مبذول ہوئی مثلاً تخلیق قرض (Credit Creation) مرکزی بنک کاری (Central Banking) مالی پالیسی کے اغراض و مقاصد، وغیرہ۔ پھر مسلم ماہرین معاشیات کو جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ مالی پالیسی، کسی خلاء میں کام نہیں کرتی۔ اس کا تعلق مالیاتی پالیسی، ملک کی عام معاشی پالیسی، حکومت کا معیشت میں رول، اور معاشی نظام کے اغراض و مقاصد، سے بھی ہے۔ چنانچہ اسلامی معاشیاتی نقطۂ نظر سے ان تمام موضوعات پر خاصا تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ اس مقالے کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس معتدبہ علمی ذخیرے کے نمایاں نقوش سے اردو داں طبقے کو روشناس کرایا جائے۔

اسلامی معاشیات کی ماہیت

اسلامی نقطۂ نظر سے جدید معاشیات کی سب سے بڑی خامی اس کی غیر اخلاقی

(amoral) ماہیت ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مغرب میں بھی اقتصادیات اور اخلاقیات کا جنم ساتھ ساتھ ہوا اور ان کو ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ چونکہ معاشیات انسانی اور سماجی رشتوں سے بحث کرتی ہے۔ اس لیے یہ سماجی آدرشوں اور اخلاقیات سے بالاتر نہیں ہوسکتی۔ جدید معاشیات ایک سماجی علم ہونے کے باوجود تیقن کے اس درجہ پر پہونچنے کا دعویٰ کرتی ہے جو قدرتی علوم کو حاصل ہے (حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قدرتی علوم بالخصوص جدید طبیعات، کامل تیقن کا دعویٰ نہیں کرتے، بلکہ اپنے نتائج کی ظنی اور قیاسی نوعیت کو علی الاعلان بیان کرتے ہیں)۔ اس درجہ تیقن تک پہونچنے کے لیے جدید معاشیات اپنی مثبت ماہیت (positivist nature) اور اقدار سے بے گانگی (Value Neutrality) پر زور دیتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی معاشیات، بعض فراموش شدہ تصورات جب صحیح اور غلط، مناسب اور نامناسب جائز اور ناجائز، وغیرہ کو تجزیہ میں شامل کرنا چاہتی ہے۔ جدید معاشیات کا محور کارگذاری (efficiency) کا حصول ہے۔ اسلامی معاشیات میں کارگذاری کے ساتھ ساتھ سماجی و معاشی انصاف پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ جدید معاشیات میں تجزیہ کی بنیاد فرد، اور انفرادی مفاد ہے۔ وہ اس مفروضہ کو مسلّم مان کر چلتی ہے کہ انفرادی مفاد (self interest) معاشی اعمال کا واحد طاقتور محرک (Motive) ہے۔ اسلامی معاشیات کے ماہرین اس پر اصرار کرتے ہیں کہ فرد کے ساتھ جماعت اور انفرادی مفاد کے ساتھ اجتماعی مفاد کا خیال رکھنا بھی فرد کی اخلاقی (اور مذہبی) ذمہ داری ہے مزید یہ کہ معاشی افعال کا کوئی واحد محرک نہیں ہے۔ انفرادی مفاد کے ساتھ ساتھ اجتماعی مفاد، بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود، ہمدردی، حب الوطنی، خوف خدا، وغیرہ بھی معاشی افعال کے محرک ہوسکتے ہیں۔ اسلامی معاشیات اس بات سے منکر نہیں ہے کہ انفرادی مفاد کا جذبہ بہت سے معاشی افعال کا ایک بڑا محرک ہے۔ لیکن وہ انفرادی مفاد کو اس قدر بے قید اور آزاد نہیں چھوڑنا چاہتی کہ دوسرے افراد کے مفادات معرض خطر میں پڑجائیں اس لیے سماجی فلاح کا تقاضہ ہے کہ انفرادی مفاد، انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری، اور اخلاقیات کے تابع فرمان رہے۔ معاشی عقلیت (Economic Rationalism) اور انفرادی مفاد کسی اخلاقی اور قانونی دائرے میں رہ کر ہی بہترین

طور پر کام کر سکتی ہیں۔ اسلامی معاشیات کے سلسلے میں یہ اخلاقی اور قانونی دائرہ شریعت کا عطا کردہ ہے۔

معاشیاتی تجزیہ میں سماجی اور اخلاقی اقدار اسی دائرے کے ذریعہ داخل ہوتی ہیں۔ نظریاتی معاشیات کی سطح پر، یہ اقدار چار طریقوں سے تجزیہ پر اثر انداز ہو سکتی ہیں: مفروضات کے اختیار کے ذریعہ؛ معاشی قضایا کے اختیار کے ذریعہ، ان قضایا کی تفتیش کے لیے جو ذرائع استعمال کیے جائیں اور تجزیہ کے طریق کار کے ذریعہ۔ اس طرح اقدار سے فرار کا کوئی امکان نہیں۔ مغرب میں مثبت معاشیات کی اقدار سے بے گانگی کے جو دعوے کئے جاتے ہیں اس کی کوئی ٹھوس علمی بنیاد نہیں ہے۔ مثبت معاشیات میں بھی اقدار ان چار طریقوں سے داخل ہوتی ہیں اور چونکہ مغربی معاشیات کا ارتقا مغربی تہذیب کے تناظر میں ہوا ہے اس لیے اس میں پائی جانے والی اقدار مغربی تہذیب سے مستعار لی گئی ہیں۔ لیکن مثبت معاشیات اپنے عینیاتی (Normative) پس منظر کو اجاگر نہیں کرتی بلکہ اس کے برعکس معروضیت کے بلند بانگ دعوے کرتی ہے۔

دوسری طرف اسلامی معاشیات علی الاعلان یہ تسلیم کرتی ہے کہ اس کی اقدار کا منبع اسلامی مصادر ہیں اور وہ اس کے طریق کار کا جزو لاینفک ہیں۔ اسلامی معاشیات میں مفروضات اور سماجی اقدار اسلامی مصادر سے، مثبت بیانات (Positive statments) جدید معاشیات اور اسلامی مصادر دونوں سے لیے جاتے ہیں، اس طرح اقدار، مثبت بیانات، اور سماجی رشتوں کو معروف طریق ہائے تجزیہ سے ایک منضبط شکل دی جاتی ہے۔

ایک منضبط علم کی حیثیت سے اسلامی معاشیات کی زمانی عمر کم سہی، اور یہ بھی صحیح ہے کہ اسلامی معاشیات اپنی ترقی کے ابتدائی مراحل میں ہی ہے لیکن اس کے مندرجات اور اس کے فلسفیانہ پس منظر کے بارے میں بھی یہی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اس کے پس منظر میں اسلامی فکر کی ایک صحت مند اور طاقتور روایت ہے۔ ماضی میں اسلامی مفکرین، فقہا، اور صوفیا، نے بھی قیمتوں کے نظام، زر، تجارت، تبادلہ، بازار، تجارتی چکر، عوامی مالیات، حکومت کے حقوق اور فرائض اور معاشیات کی پالیسی جیسے موضوعات پر غور و فکر کیا ہے۔ اسلامی فکر کی یہ وراثت اسلامی معاشیات کا سرمایہ ہے، لیکن اس ورثہ کو از سر نو دریافت

کرنے کی ضرورت ہے تاکہ عصر حاضر کی ضروریات کی روشنی میں ان کی افادیت کا فیصلہ کیا جاسکے اور اگر مناسب ہو تو اس روایت کو آگے بڑھانے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

اسلامی معاشیات اور فقہ اسلامی

ہم اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اسلامی معاشیات کی جڑیں اسلامی اقدار اور اسلامی اخلاقیات میں ہیں، اس لیے فطری ہے کہ اس کا اسلامی علوم سے بھی گہرا رشتہ ہو۔ اسلامی علوم کو عام طور پر چار مختلف علوم میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) علوم القرآن (۲) علوم الحدیث (۳) اصول فقہ (۴) فقہ۔ ضروری ہے کہ اس مرحلہ پر شریعت اور فقہ کے درمیان امتیاز کو واضح کر دیا جائے۔ شریعت کا مفہوم ان تمام خدائی احکامات سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اپنے رسول، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائے۔ اس طرح قرآن پاک اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریعت کا جزو ہیں۔ یعنی قرآنی احکامات اور سنت رسولؐ کو تشریعی درجہ حاصل ہے۔ شریعت مستقل ناقابل تبدیل، اور زمان و مکان سے ماورا ہے۔ اس کی ماہیت غیر تاریخی ہے۔ فقہ، الٰہی احکامات کے انسانی فہم و ادراک کا نام ہے۔ اس لیے اس میں زمان و مکان کے ساتھ تبدیلی کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ فقہ کی نوعیت بنیادی طور پر انسانی ہے، الوہی نہیں گو کہ اس کے احکامات کا استنباط شریعت سے ہی کیا جاتا ہے۔ اس لیے فقہ کی ماہیت تاریخی ہے۔ یہ زمان اور مکان کی پابندیوں کے تابع ہے۔ قرآن اور سنت سے احکامات کا استنباط چند اصولوں کے مطابق کیا جاتا ہے۔ ان اصولوں کا مطالعہ اصول فقہ میں کیا جاتا ہے۔ اسلامی فقہ کے چار بنیادی مصادر ہیں: قرآن، سنت، قیاس اور اجتہاد۔ اسلامی علوم کے وہ ماہرین جو احکام الٰہی کی تشریح کرتے ہوئے اجتہاد کر سکتے ہیں مجتہد کہلاتے ہیں لیکن ہر کوئی نہ مجتہد ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کی توقع کی جاتی ہے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ ماہرین معاشیات اور سماجی علوم کے دوسرے ماہرین، جو اہم ہم عصر مسائل کے اسلامی حل دریافت کرنا چاہتے ہوں اور اپنے اپنے علوم کا مطالعہ اسلامی تناظر میں کرنا چاہتے ہوں، اسلامی فقہ کا ضروری علم حاصل کریں۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ فقہ اسلامی میں اختصاص حاصل کریں اور ہر کس و ناکس اجتہادی رائے دینے لگ جائے۔ فی الحقیقت سماجی علوم کے اسلامی تناظر میں

تحقیقی کام کرنے کے لیے فقہ کا صرف اتنا علم ضروری ہے کہ سماجی علوم کے ماہرین، فقہی اور غیر فقہی آراء اور بیانات کی اسلامی نوعیت کا صحیح صحیح تعین کر سکیں۔

اسلامی فقہ کو دو بڑی شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: فقہ عبادات اور فقہ معاملات۔ اول الذکر کا تعلق خالق اور مخلوق کے مابین تعلقات سے ہے جبکہ موخر الذکر کا محور انسانوں کے باہمی تعلقات ہیں۔ گو کہ تمام مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ فقہ عبادات کا کچھ علم حاصل کریں (مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے مسائل تاکہ وہ ان عبادات کو صحیح طور پر انجام دے سکیں) ماہرین معاشیات اور سماجی علوم کے دوسرے ماہرین کے لیے فقہ معاملات خاص اہمیت کا حامل ہے۔

اسلامی معاشی نظام

اسلامی معاشیات دراصل اسلامی معاشی نظام کے مطالعہ کا نام ہے بالکل اُسی طرح جیسے سرمایہ دارانہ معاشیات، سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی معاشیات، اشتراکی نظام کا مطالعہ ہے۔ اس لیے اسلامی معاشیات کی وضاحت کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم اسلامی معاشی نظام کی ماہیت کو واضح کریں اور مختلف پہلوؤں سے اس کی کارکردگی کا مطالعہ کریں۔

معاشی نظام سے ہماری مراد ان تمام اداروں اور ان اداروں کے پس پشت کارفرما اصولوں سے ہے جو کوئی معاشرہ اپنے معاشی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے قائم کرتا ہے کسی بھی معاشی نظام کے اجزائے ترکیبی میں مندرجہ ذیل کا ہونا ضروری ہے۔ (۱) معاشی نظام کے مقاصد کا تعین (۲) ان مقاصد کو حاصل کرنے کے ذرائع کا تعین (۳) ان اداروں کا قیام جن کے ذریعہ معاشی نظام اپنی کارگذاری انجام دے۔ اسلام کے معاشی نظام کا مطالعہ بھی انھیں اجزائے ترکیبی کے حوالے سے کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک معاشی اداروں کا سوال ہے، کسی بھی معیشت میں، معاشی وسائل کی ملکیت کے سوال کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً سرمایہ دارانہ معیشت کی ممتاز خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں افراد کو نجی ملکیت کا حق ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی معاشی نظام میں ملکیت کے حق کے ساتھ ساتھ وسائل کے مالکوں پر کچھ ذمہ داریاں

اور فرائض بھی عائد کیے جاتے ہیں۔

اسلامی معاشی نظام میں جائداد کی ملکیت کے تین بڑے اور معروف طریقے ہیں: نجی ملکیت، عوامی ملکیت، اور رضاکارانہ ملکیت (اوقاف)۔ نجی ملکیت کے سلسلے میں فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اسلام نہ صرف نجی ملکیت کا حق دیتا ہے، اسے تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کا احترام بھی کرتا ہے۔ لیکن سرمایہ دارانہ معیشت کے برعکس اسلامی نظام میں جائداد کی نجی ملکیت کا حق، ایک مطلق (Absolute) حق نہیں ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے نجی جائداد، افراد کے پاس اللہ کی ایک امانت ہے کیونکہ آخری تجزیہ کے طور پر وہی ان تمام چیزوں کا مالک ہے جو اُس نے پیدا کی ہیں۔ پس، افراد کا فرض ہے کہ وہ اس امانت کا استعمال، اس طور پر کریں جو معاشرے میں شر کے بجائے خیر کا باعث ہو۔ سرمایہ دارانہ معیشت کی طرح اسلامی معاشی نظام میں، افراد کو اس بات کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنی جائداد کا کوئی غلط استعمال کر سکیں یا اُسے برباد کر سکیں۔ فی الحقیقت اسلام جائداد اور دیگر معاشی وسائل کے بہترین استعمال کے لیے نہ صرف تعلیم دیتا ہے۔ بلکہ ضروری احکام کے ذریعہ اسے ناگزیر بھی بنا دیتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنی جائداد کا صحیح انتظام نہیں کرتا (یعنی فقہی اصطلاح میں سفیہ ہے) تو ریاست کو اس بات کا حق ہے کہ وہ جائداد کے مناسب انتظام و انصرام کے لیے کسی متولی کا تقرر کرے۔

اسی طرح اہلِ ثروت کو اپنی دولت کے زیاں، اس کے ناجائز استعمال اور اس کو تباہ و برباد کرنے کا حق نہیں ہے۔ اسلام اہل ثروت پر بعض اخلاقی پابندیاں عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے وسائل کا صحیح استعمال کریں کیونکہ روزِ آخرت ہر اہلِ ثروت کو اس بات کے لیے جوابدہ ہونا پڑے گا کہ اس نے اپنی دولت کا استعمال کس طرح کیا۔

اسلامی معاشی نظام میں عوامی ملکیت جائز ہے لیکن نجی ملکیت کی طرح عوامی ملکیت کا تصور بھی مطلق نہیں ہے۔ اگر انفرادی ملکیت کے حقوق محدود ہیں تو ریاستی ملکیت کے حقوق بھی محدود ہونے چاہئیں۔ اگر افراد خدا کے سامنے جوابدہ ہیں تو اسی طرح ریاست بھی عوام اور خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ معیشت میں ریاست کی دخل اندازی کا معیار مصلحت عامہ کے مطابق ہوگا جس کا تصور امام غزالی اور شاطبی نے پیش کیا ہے۔

اسلامی معاشی نظام کا ایک مخصوص اور ممتاز ادارہ وقف کا نظام ہے جو رضا کارانہ اجتماعی ملکیت کی ایک شکل ہے۔ اس ادارے کے ذریعہ اہل ثروت مسلمان اپنی دولت اور جائداد، یا اس کا کوئی حصہ عام معاشرتی فلاح و بہبود، یا کسی ایسے مقصد کے لیے جو اپنے آپ میں اخلاقی یا مذہبی نقطۂ نظر سے قابل قدر ہو، محفوظ کر سکتے ہیں۔ نظام اوقاف کی ایک خاصیت یہ ہے کہ یہ حکومت کی دخل اندازی کے بغیر رضا کارانہ اجتماعی اقدام کے ذریعہ فلاحی سرگرمیوں کے منظم کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ ماضی میں ایک ادارے کے طور پر اوقاف نے اسلامی ممالک میں فلاح و بہبود خاص کر تعلیم، طبی سہولتوں، اور سماجی تحفظ کے میدانوں میں ایک نہایت مفید کردار ادا کیا ہے۔ یہ ادارہ موجودہ اسلامی معاشروں کی تعمیر نو اور ترقی میں بھی ممد و معاون ہونے کے بے پناہ امکانات رکھتا ہے۔

نظام ملکیت کے علاوہ معاشی نظام کا مطالعہ کرنے کے لیے معیشت کے مقصد، محرکات، فیصلہ سازی کے نظام اور حکومت کے رول کا بھی تجزیہ کرنا چاہیے۔ جزئی سطح پر، صرف، پیداوار، تبادلہ اور تقسیم کے مختلف پہلوؤں کے تجزیہ کی بنیاد پر بھی مختلف معاشی نظاموں کے درمیان تمیز کی جا سکتی ہے۔ اسلامی معاشی نظام میں محرک کا تعین صرف دنیاوی بنیادوں پر نہیں کیا جا سکتا بلکہ نجات اخروی بھی معاشی افعال کا محرک ہو سکتا ہے۔ عوامی اہمیت کے مسئلوں پر فیصلہ شوریٰ کے ذریعہ ہوگا۔ دوسرے تمام معاشی فیصلے اصولی طور پر بازار میں کیے جائیں گے جب کہ حکومت ان فیصلوں میں توازن لانے اور برقرار رکھنے کا کام انجام دے گی۔

مسلم ماہرین معاشیات کے درمیان اس امر پر کافی اختلاف پایا جاتا ہے کہ اسلامی نظام معیشت میں حکومت کا کردار کیا ہونا چاہیے۔ کچھ ماہرین معیشت میں حکومت کی بیش از بیش مداخلت چاہتے ہیں جب کہ دوسرے حکومت کے فعال کردار کے مخالف ہیں اور اس کا کردار محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں مواقف کی حمایت میں تاریخی اور فقہی دلائل دیئے جا سکتے ہیں۔ تاہم اسلام کی راہ توازن اور اعتدال کی راہ ہے۔ اس لیے شاید بیشتر لوگ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ اسلامی معیشت میں حکومت کا کردار نہ تو خالص سرمایہ دارانہ نظام کی طرح مجہولیت پسند ہے اور نہ اشتراکی نظام کی طرح کلیت پسند اس کے برعکس، حکومت، اسلامی نظام میں، نگہبانی اور رہنمائی دونوں فرض انجام دے گی۔

اسلامی معیشت میں، اگر نجی اور عوامی مصالح کے درمیان ٹکراؤ کی کوئی صورت پیدا ہوئی تو حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ان مصالح کے درمیان توازن لانے کی غرض سے معیشت میں مداخلت کرے بصورت دیگر حکومت کی عام نگہبانی اور رہنمائی میں، نجی معیشت اپنے فیصلوں کے لیے آزاد ہوگی۔

اسلامی معاشیات کے ماہرین اس امر پر متفق ہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے دولت وثروت کی تقسیم میں عدل وانصاف کو غایت درجہ اہمیت حاصل ہے۔ اس ضمن میں بعض مسلم ماہرین معاشیات کا خیال یہ ہے کہ اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی، عدل اور احسان کے اسلامی اصولوں سے رہنمائی حاصل کرے گی، اس کا مقصد یہ ہوگا معاشرے میں ہر فرد کو سماجی ومعاشی انصاف حاصل ہو۔ اسلامی ریاست، اپنی حدود میں رہنے والوں کی بنیادی ضروریات کی تسکین کے لیے مناسب اور ضروری اقدام کرے گی اس مقصد کے حصول کے ساتھ ساتھ معیشت دوسرے شرعی مقاصد کے حصول کے لیے بھی کوشاں ہوگی مثلاً آمدنی اور دولت کی نابرابری میں تخفیف، افراد کے نفس باطنی اور اموال ظاہرہ کا تزکیہ، اور عوام میں جذبۂ خیر سگالی کا فروغ۔ ان تمام مقاصد کے حصول کے لیے اسلامی معیشت میں کئی ذرائع (Instruments) ہیں۔ فطری طور پر ان ذرائع میں زکوٰۃ کے نفاذ اور محاصل زکوٰۃ کی تقسیم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن ان مقاصد کے حصول میں زکوٰۃ کی اہمیت کو اجاگر کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلامی معاشرے میں تقسیم دولت پر اثرانداز ہونے والے دوسرے ادارے اور ذرائع کم اہمیت کے حامل ہیں یا سرے سے مفقود ہیں۔ فی الواقع یہ نقطۂ نظر حقیقت سے بعید ہے کیونکہ اسلامی معاشرے میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی ایسے کئی ادارے ہیں، مثلاً ربا کی حرمت، مشارکت اور مضاربت کا فروغ، نفع میں شرکت کی عام ترغیب، اجارہ داری کی ممانعت، وراثت کے قوانین، فطری ذرائع پیداوار میں عوام کے مساوی حقوق، ایسے ادارے ہیں جو معاشرے میں آمدنی اور دولت کی نابرابری کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کریں گے تاکہ لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم (اور یہ (دولت) تم میں سے اہل ثروت کے درمیان ہی چکر نہ کاٹتی رہے) کا قرآنی مقصد حاصل ہو سکے۔

جزئی معاشیات

اسلامی معاشیات کے تشکیلی عناصر میں سے جزئی معاشیات (Micro economics) غالباً سب سے کم ترقی یافتہ ہے۔ تاہم اسلامی معاشیات کے کئی ماہرین نے اسلامی تصورات اور اسلامی اقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے نظری معاشیات (Economic Theory) کی تشکیل نو کی قابل قدر کوششیں کی ہیں اس ضمن میں ان علماء کا طریق کار یہ رہا ہے کہ انھوں نے معاشیات کے متداول اصول تحلیل کا استعمال کرتے ہوئے انسانی برتاؤ اور معاشی رویہ کا مطالعہ ایسی حالت میں کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی اقدار اسلامی مصادر سے مستعار لی گئی ہوں۔

تاہم اس بات کو واضح کر دیا جانا چاہئے کہ اس طریق استدلال کا استعمال کرتے ہوئے جن نتائج کا استخراج کیا جائے وہ مسائل کے ایسے "اسلامی حل" ہوں کہ ان کے سوا دوسرا حل ممکن نہ ہو۔ فی الحقیقت یہ نتائج ان تمام اعتراضات کی حد میں آسکتے ہیں جو نظریاتی طریق استخراج (Theoretical methods of deduction) پر عام طور پر عائد کیے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ نتائج مفروضات کی تبدیلی کے تئیں کافی حساس ہوتے ہیں اگر مفروضات و مسلمات میں ذرا بھی تبدیلی کر دی جائے تو ضروری نہیں کہ منطقی طور پر دوبارہ انھیں نتائج کا استخراج کیا جا سکے جو پہلے اخذ کیے گئے تھے۔ دوسرے یہ کہ جن ماہرین معاشیات نے نظریاتی سطح پر اس طرح کی کوششیں کی ہیں ضروری نہیں کہ ان سب کو شریعت کا کماحقہٗ علم ہو۔ اس لیے ان کی تعبیریں ہر حلقۂ فکر کے لیے یکساں طور پر قابل قبول نہ ہوں، اس امر کا بھی کافی احتمال ہے۔

تاہم ان دشواریوں کے باوجود اسلامی تناظر میں جزئی معاشیات کی نشوونما، اسلامی ماہرین معاشیات کے لیے، اور مستقبل میں اسلامی معاشیات کے ارتقاء اور فروغ کے لیے غالباً سب سے بڑا چیلنج ہے۔ کیونکہ بالآخر یہ جزئی معاشیات ہی ہے جو نہ صرف کلی معاشیات بلکہ معاشی پالیسیوں کے لیے بھی نظریاتی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ چنانچہ اس چیلنج کا سامنا کرتے ہوئے بعض ماہرین معاشیات نے کچھ قابل قدر کوششیں کی ہیں۔ ان میں سے چند کا اجمالی تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔

جزئی معاشیات کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کوئی فرد (یا معاشیات کی اصطلاح میں صارف) کسی چیز کی طلب کیوں کرتا ہے۔؟ معاشیات میں اس سوال کا روایتی جواب یہ ہے کہ صارف ان کی طلب کرتا ہے جن میں اُسے افادیت محسوس ہوتی ہے اور جو اس کی کسی ضرورت (Wants) کی تسکین کرتی ہیں۔ بعض اسلامی ماہرین معاشیات کی تجویز ہے کہ اسلامی معاشیات میں نظریہ صرف کی بنیاد ضرورت کے بجائے حاجت (need) پر ہونا چاہیے اس طرح افادیت کے نظریہ (utility theory) کو نظریۂ مصلحت سے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ مصلحت سے مراد کسی چیز یا خدمت کی اس خاصیت سے ہے جس کے ذریعہ انسانی زندگی کے کسی مقصد، یا بنیادی عنصر کو فروغ ملتا ہو۔ حیات، مال، ایمان، عقل، اور نسل کا تحفظ یا فروغ انسانی وجود کے وہ بنیادی عناصر ہیں جن کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ اس چیز کے استعمال میں مصلحت ہے یا نہیں۔ افادیت کی طرح مصلحت کا تصوّر داخلی (Subjective) ہوسکتا ہے۔ لیکن افادیت کے برعکس اس تصوّر میں بڑی حد تک معروضیت (Objectivity) پائی جاتی ہے۔ تاہم ان تصورات کا استعمال کرتے ہوئے بازار میں اشیاء کی خرید و فروخت اور قیمتوں کے تعین جیسے اعمال کی وضاحت کے لیے ابھی مزید ریسرچ کی ضرورت ہے۔

اسلامی معاشیات کے وکلاء نے ذرائع پیداوار اور ان کی قیمتوں کے تعین کی بھی نئی تعبیریں کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ روایتی معاشیات میں تین اہم ذرائع پیداوار کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ زمین یا قدرتی ذرائع پیداوار، سرمایہ اور محنت، بعض اوقات تنظیم کو ایک چوتھا ذریعہ پیداوار متصوّر کیا جاتا ہے۔ ساری پیداوار ان ذرائع کے مالکوں کے درمیان تقسیم ہوجاتی ہے۔ اسے نظریۂ تقسیم Theory of distribution کہتے ہیں۔ اس طرح زمین یا قدرتی ذرائع پیداوار کے لیے لگان، سرمایہ کے لیے سود، اور محنت کے لیے اجرت ان ذرائع پیداوار کا معاوضہ قرار پائیں گے۔ اسلامی نظام معیشت میں سود (یا ربا) حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے لازم ہوا کہ پیداوار کی تقسیم پر ازسرنو نظر ڈالی جائے۔ اس کے ساتھ ہی ذرائع پیداوار کی نئی تعریف کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ جہاں تک محنت کے لیے اجرت کا سوال ہے اس پر تو کسی قسم

کے نزاع کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس بات پر اتفاق رائے کچھ مشکل نہیں کہ محنت کی اجرت اس کی پیداآوری کے تناسب سے ہونا چاہیے اور اس کا پیداوار میں حق ہے۔ لیکن سود، اجارہ دارانہ منافع اور غیر مناسب لگان کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر سے شدید شبہات موجود ہیں۔ سود کے حرام ہونے کے باعث بعض اسلامی ماہرین معاشیات نے "سرمایہ" کی تعریف ایسی شکل میں کرنے کی کوشش کی ہے جس میں "نقد سرمایہ" شامل نہ ہو۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اسلام میں سرمایہ کے معاوضہ کی کوئی ممانعت نہیں ہے بلکہ اس معاوضہ کی ایک خاص شکل کو جس کا مظہر سود ہے، حرام قرار دیا گیا ہے۔ سود، سرمایہ کے لیے پہلے سے طے شدہ معاوضہ ہے جس کی شرح بھی، پیداوار کے نتیجہ (نفع یا نقصان) سے الگ ہو کر مقرر کی جاتی ہے۔ اسلامی معاشیات میں نقد سرمایہ کو پیداوار کے ایک حصّہ کا مستحق اسی وقت قرار دیا جاتا ہے جب وہ کاروبار کی خطر انگیزی (Risk) میں شریک ہو۔ اسلامی نقطۂ نظر سے نقد سرمایہ کا معاوضہ، سود نہیں بلکہ نفع کا ایک حصّہ ہے جو اس خطر انگیزی انگیخت کرنے کے عوض ملتا ہے۔

اسی طرح زمین کے لگان کے متعلق بھی واضح اسلامی اصول ہیں۔ فقہ کی کتابوں میں عشر اور خراج عائد کرنے کے لیے عشری اور خراجی زمینوں کی تفریق اور ان کے متعلقہ خصائص تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

روایتی معاشیات میں پیداوار کا محرک "منافع" قرار دیا جاتا ہے۔ گو کہ اسلامی معاشیات میں منافع کا حصول ممنوع نہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ تحریک اسلام کے اخلاقی اصولوں کی پابند رہے۔ کچھ ماہرین معاشیات نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اسلامی معیشت میں مختلف قسم کے کاروباروں اور صنعتوں کے چلانے کو "فرض کفایہ" کی حیثیت حاصل ہے۔

کُلّی معاشیات

جزئی معاشیات کی نسبت کلی معاشیات (Aggregate Economics) یا (Macro economics) نے اسلامی ماہرین معاشیات کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ رہا

ہے کہ اسلامی ماہرین معاشیات اس سوال کا جواب دینے کے لیے کوشاں رہے ہیں کہ عصر حاضر میں، جب کہ تمام معاصر معاشی نظام اور جدید معیشتیں، سودی عناصر پر قائم ہیں، اسلامی نظام معیشت، اپنے غیر سودی نظام، زکوٰۃ منافع میں شرکت اور دوسری اسلامی خصوصیات کے ساتھ کیسے عمل پذیر ہوگا۔؟ اس لیے علم معاشیات کے مسلم ماہرین کی توجہ اس قسم کے مسائل پر مرکوز رہی ہے کہ غیر سودی بنک کاری نظام کس طرح قائم کیا جائے۔ اس کے عملی مسائل کیا ہوں گے اور ایک غیر سودی نظام کا نظریاتی جواز کیا ہے؟ سود کی عدم موجودگی میں زر کا بازار میں توازن کا حصول کس طرح ہوگا۔؟ کیا سود کی عدم موجودگی بچت اور خواہش بچت (Propensity to save) پر اثر انداز ہوگی۔ اگر ہاں تو کس طرح۔؟ معیشت میں وظیفۂ بچت اور وظیفۂ سرمایہ کاری کس طرح سرانجام پائیں گے؟ قومی آمدنی کا تعین کیسے ہوگا اور اس ضمن میں زر پالیسی اور مالیاتی پالیسی کا کردار کیا ہوگا؟

کلی معاشیات میں، نظریہ اخراجات صرف، وظیفۂ بچت و صرف اور عوامی اخراجات کو اہمیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ ان کے ذریعہ ہی قومی آمدنی کا تعین ہوتا ہے۔ اخراجات صرف کے سلسلے میں، اسلامی معاشیات کے بعض ماہرین نے خواہش صرف (Propensity to consume) پر زکوٰۃ کے اثرات کا اندازہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں عام رائے یہی ہے کہ معیشت میں زکوٰۃ کے نفاذ کے اثرات مثبت ہونے کی توقع ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ کے ذریعہ دولت کی دوبارہ تقسیم عمل میں آتی ہے۔ اور دولت ان لوگوں کی طرف سے جن کی خواہش بچت زیادہ ہے۔ ان لوگوں کی طرف منتقل ہوتی ہے جن کی خواہش صرف زیادہ ہے، اس لیے اخراجات صرف میں اضافہ ہوگا جو آمدنی میں اضافہ کا باعث بھی بنے گا۔

جہاں تک بچت اور سرمایہ کاری کا تعلق ہے، تو ملحوظ رہے کہ جدید معیشت میں بچت کار (Savers) اور سرمایہ کار (Investors) ایک ہی لوگ نہیں ہوتے۔ موجودہ زمانے میں صنعتی پروجیکٹوں کو لاگو کرنا اور چلانا ایک پیچیدہ عمل ہے۔ جس کو ہر وہ شخص انجام نہیں دے سکتا جس کے پاس تھوڑا بہت سرمایہ ہو۔ جدید صنعتی زندگی کی ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ بچت کاروں کی ایک بڑی تعداد بہت چھوٹی چھوٹی بچتوں کی مالک ہوتی ہے دوسری طرف سرمایہ کاری کے لیے بڑی رقوم کی

ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ بچت کاروں اور سرمایہ کاروں کے گروہوں میں تفریق پیدا ہوگئی ہے۔ جو لوگ بچت کرتے ہیں وہ خود سرمایہ کاری نہیں کرتے اور جو لوگ سرمایہ کاری کرتے ہیں وہ خود بچت نہیں کرتے۔ اس طرح بچت اور سرمایہ کاری کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے مالی ثالثی (Financial intermediation) کی ضرورت پڑتی ہے۔ روایتی معیشت میں یہ کام سود کے ذریعہ انجام پاتا ہے اور اسلامی معیشت میں یہ وظیفہ نفع میں شرکت کی شرح (Profit sharing ratio) کے ذریعہ انجام پائے گا۔ اس سلسلے میں یہ اندیشہ پایا جاتا ہے کہ ایک غیر سودی نظام معیشت جس میں سود کے بجائے نفع میں شرکت کا نظام رائج ہو، ہوسکتا ہے کہ اتنی بچت کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے جو سرمایہ کاری کے لیے درکار ہو، اس طرح بچت اور سرمایہ کاری میں ہم آہنگی نہ ہوسکے۔ اسلامی ماہرین معاشیات کی بعض تازہ ترین تحقیقات اس کی شاہد ہیں کہ یہ اندیشے بے بنیاد ہیں۔ اسلام میں سرمایہ (بچت) کا معاوضہ ممنوع نہیں ہے۔ بلکہ سود کی شکل میں یہ ممنوع ہے۔ منافع میں شرکت کی شکل میں بچت کا معاوضہ شرعاً بالکل جائز ہے کیونکہ سود کی طرح نہ تو یہ پہلے سے طے شدہ ہے اور نہ ہی غیر تغیر پذیر۔ اس طرح ماہرین معاشیات اسلامی معیشت کے لیے ایسے وظیفۂ بچت اور وظیفۂ سرمایہ کاری کی تشکیل کرسکتے ہیں کہ بچت کا انحصار تو منافع میں شرکت کی شرح پر ہو اور وظیفۂ سرمایہ کاری اس سے آزاد ہو۔ بعض مسلمات کے تحت یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی مالی نظام میں خطر انگیزی میں اضافہ کے بغیر بچت کے لیے معاوضہ میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اسلامی مالی نظام میں سودی نظام کے مقابلہ میں استحکام اور نمو کی صلاحیت بھی پائی جاتی ہے۔

بعض ماہرین نے اسلامی معیشت کے لیے آمدنی کے تعین کے لیے مختلف ماڈل بھی تشکیل کیے ہیں جن میں زکوٰۃ اور منافع میں شرکت کو شامل کیا گیا ہے۔

زرپالیسی اور مالیاتی پالیسی

ربا کی حرمت زکوٰۃ کے اطلاق اور منافع میں شرکت کے اصول کے نفاذ کی روشنی میں اسلامی معیشت میں زرپالیسی، اور مالیاتی پالیسی کی خاص اہمیت ہے۔ ان

موضوعات پر جدید ترین تحقیقات سے یہ نتائج سامنے آئے ہیں کہ روایتی نظام بینکوں میں جمع رقوم کی ظاہری قدر، یا ان جمع کھاتوں پر شرح معاوضہ کی ظاہری قدر (Nominal value) کی ضمانت نہیں دیتا جیسا کہ منافع میں شرکت کے اصول پر قائم اسلامی بنک کاری نظام میں ممکن ہے۔ دوسرے یہ کہ اسلامی بنک کاری نظام میں کھاتہ داروں کو متعین معاوضہ نہ دئے جانے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی بنک کاری کا نظام استحکام کی وہ خاصیت رکھتا ہے جو روایتی نظام میں موجود نہیں۔ ان نتائج کی روشنی میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جہاں تک زر پالیسی کے مقاصد، اور کارکردگی کا تعلق ہے اسلامی بنک کاری، اور روایتی بنک کاری کے نظام میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اس لیے روایتی بنک کاری سے اسلامی بنک کاری نظام کی طرف سبقت کرنے میں کسی مالی بحران کا اندیشہ نہیں۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس میں کسی طرح کے مسائل پیش ہی نہیں آئیں گے۔

اسلامی معاشیات کے موضوع پر ہم عصر لٹریچر کا ایک بڑا حصہ اسلامی بنک کاری، اس کے نفاذ، اثرات اور دوسرے متعلقات پر مشتمل ہے۔ اسلامی بنک کاری میں بیع کے متعدد معاہدوں کا اطلاق کیا گیا ہے جو کلاسیکی عہد میں رائج تھے۔ لیکن ان معاہدوں کی تفاصیل میں عصر جدید کے تقاضوں کے مطابق کچھ نہ کچھ کتر بیونت ضرور کی گئی ہے۔ ان معاہدوں میں مضاربت، مشارکت، مرابحہ، ایجار اور بیع مؤجل وغیرہ شامل ہیں۔ فی الحقیقت مالی زمرے میں ان کا استعمال بھی عہد جدید کا ہی اجتہاد تھے ورنہ اصلاً تو یہ معاہدے اشیاء کی خرید و فروخت کے لیے وضع کیے گئے تھے۔

عوامی مالیات تو اسلامی معاشیات کا وہ جزء ہے جس کا ارتقاء اسلامی عہد کی ابتداء میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ عصر حاضر میں عوامی مالیات میں مالیاتی پالیسی (Fiscal - Policy) کے مسائل بھی شامل ہو گئے ہیں۔ مالیاتی پالیسی کے مقاصد کی رو سے اسلامی معیشت کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام شہریوں کے لیے بنیادی ضروریات فراہم کرے اور اس مقصد کے لیے وسائل مہیا کرے۔ یہ بدیہی امر ہے کہ زکوٰۃ کا نظام اسلامی معیشت کی مالیاتی پالیسی میں مرکزی کردار ادا کرے گا۔ اسلامی ممالک میں موجودہ اقتصادی پسماندگی اور وسیع پیمانے کی غربت کے پیش نظر، زکوٰۃ اور مالیاتی پالیسی کی اہمیت میں دوچند اضافہ

ہو جاتا ہے۔

اختتامیہ

مندرجہ بالا صفحات میں اسلامی معاشیات کا ایک خاکہ پیش کرتے ہوئے اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ گذشتہ پندرہ بیس سال میں کی گئی علمی کوششوں کے خدوخال نمایاں ہو جائیں۔ اسلامی معاشیات کو ابھی ترقی کے بہت سے مراحل طے کرنا ہیں۔ اس سلسلے میں چاہے تکنیکی دشواریاں کتنی بھی ہوں لیکن وہ قابل عبور ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑی دشواری عملی مثالوں کی کمی ہے۔ اب تک جن مسلم ممالک نے اسلامی اقتصادی نظام کی راہ پر بڑھنے کا فیصلہ کیا ہے ان کی تعداد بہت کم ہے۔

معاشیات ایک ایسا علم ہے کہ عملی معاشی زندگی، اور نظری معاشیات کی ترقی ساتھ ساتھ ہوئی ہے۔ جب عملی زندگی میں مسائل پیش آتے ہیں اور ان کے قابل عمل حل دریافت کیے جاتے ہیں تب نظریہ ساز (Theoretician) اس کا نظریاتی جواز پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح نئے نظریے وجود میں آتے ہیں۔ نظریہ کی اصل کسوٹی عملی زندگی ہے۔ اس لیے نظریات کو ہمیشہ اصل زندگی کے حقائق سے پرکھا جاتا ہے۔ معاشیات کی تاریخ نے اسی مرحلہ وار ترقی کو اختیار کیا ہے۔ درحقیقت تمام سماجی علوم، جو مصنوعی تجربہ گاہ سے محروم ہیں، اسی طور پر آگے بڑھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک علم کی حیثیت سے فقہ کی ترقی بھی اسی طور پر ہوئی ہے۔ اس لیے اسلامی معاشیات کی آئندہ ترقی، دوسرے تمام عوامل سے بڑھ کر، صرف ایک نکتہ پر منحصر ہے کہ اسلامی ممالک کہاں تک اپنی معیشتوں کو اسلامی قالب میں ڈھالتے ہیں اور اسلام کے عالمگیر اصولوں پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔

عورت اور اسلام

مولانا سید جلال الدین عمری

قیمت ۱۰ روپئے

ادارہ تحقیق نے اس اہم کتاب کا انگریزی ترجمہ Woman and Islam کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ تحقیقات اسلامی کا سائز، حصہ گٹ اپ، صفحات ۱۰۴، قیمت ۲۵ روپئے۔ اسکا ہندی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے